قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانا نظام کے مظاہر

ڈاکٹر عمارہ طارق

Abstract:

Quratul-Ain-Haider is an out standing and most celebrated literary figure of indian urdu novelist and short story writer. Love with pen and literature is in her genes. She considers writing a metalogical process. When she started writing radical changes were taking place, old values were diminishing and new modern trends were prevailing. There was a conflict in the glorious past and the ambitious future.

Restlessness anxiety of two world war. National and international political and economic havocs and tragedy of partition were the hot issues. In this uncertain atmosphere she was tempted to write on taboo subjects. She also took into account the complexities and problems which were the product of unequal/unjustified social systems. She instilled a new spirit in writing which was yet unexplored. Instead of highlighting the negative aspects she laments the fading civilization of feudal system. Quratul-Ain-Haider belongs to the intellectual society of Hindustan and Europe. She did not only study different civilization and histories but also herself lived and breathed the day and night of capitalist society and its civilization. This conflict and the reality of these systems is very much evident in her short stories.

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) ہمارے عہد کا ایک اہم اور بڑا نام ہے۔ اہم اور بڑا اس لیے کہ قرۃ العین نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ دور افسانے کا عہد زریں تھا۔ بڑے بڑے افسانہ نگار اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ ان بڑے لوگوں کی موجودگی میں ایک کم عمر لڑکی کے لیے نمایاں جگہ بنانا بڑا مشکل کام تھا

مگر قرۃ العین حیدر نے نہ صرف ان افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا بل کہ یہ نام آسمانِ ادب پر درخشندہ ستارہ بن کر چمکا۔ قرۃ العین حیدر کے ایک کامیاب مصنفہ بننے کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔ انھیں قلم دوستی اور ادب نوازی ورثے میں ملی تھی۔ ان کے نزدیک لکھنا ''ایک مابعد الطبیعاتی عمل ہے'' یہ داخلی تحرک جب ان کی تحریر میں شامل ہوا تو وہ تحریر خود بخود قابل توجہ بن گئی۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم، عالمی ادبیات کا مطالعہ، تاریخ کا گہرا شعور، نفسیاتی ژرف نگاہی اور اعلی خاندانی پس منظر ان کے ہمراہ تھا۔ ان تمام خصوصیات نے انھیں ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔

شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> ''کسی مصنف کا پچاس سال تک مسلسل اور بڑے تواتر کے ساتھ لکھنا اور بہتر سے بہتر ادب پارہ پیش کرنا معمولی بات نہیں۔ اس سے جہاں فن سے ان کے گہرے لگاؤ اور کمٹمنٹ کا ثبوت ملتا ہے، وہاں ان کے فن میں رچاؤ اور پختگی کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو طبعی عمر اور ادبی کام (تخلیقات) کے اعتبار سے وہ اس وقت اردو کی سب سے بڑی زندہ ادیب ہیں۔'' (۱)

قرۃ العین حیدر نے جس دور میں افسانے کی دنیا میں قدم رکھا وہ دور انقلابات کا دور تھا۔ پرانی قدریں اور بنیادیں لڑکھڑا رہی تھیں اور نئی حقیقتیں اپنا آپ منوانے کو بے تاب تھیں۔ ماضی اپنی عظمتوں کے کھنڈرات سمیت موجود تھا مگر حال اس ماضی سے گریزاں تھا اور نہ ہی وہ مستقبل کے خوابوں سے مطمئن تھا۔ ایک اضطراب، بے نیازی اور بے سکونی کا سا عالم تھا۔ دو عظیم جنگوں کی تباہی، ملکی و بین الاقوامی سیاست و معیشت کی تباہ کاریاں اور تقسیم کے المیے نے قرۃ العین حیدر کو متنوع موضوعات پر قلم اٹھانے کی ترغیب دی۔

ڈاکٹر شفیق انجم کہتے ہیں:

> ''انسانی المیوں کی بازگشت، روحانی و ذہنی اضطراب، تاریخی و تہذیبی الٹ پلٹ اور انفرادی و اجتماعی مسائل و حیات قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں بار بار دہرائے گئے موضوعات ہیں۔ یہ موضوعات اس عہد کے دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں لیکن قرۃ العین حیدر کی فلسفیانہ پیش قدمی اور گہری سنجیدہ بصیرت اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کی فنی ہنر مندی اس پر مستزاد ہے بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ فنی سلیقے اور مہارت ہی کی بدولت یہ موضوعات ارتضاع و اوج کو پہنچے ہیں تو یقیناً درست ہے۔'' (۲)

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی عکاسی منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ وہ جاگیردار طبقے کی منفی خصوصیات بیان کرنے کے بجائے ٹوٹتے ہوئے جاگیرداری نظام اور ان کی شکستہ تہذیبی اقدام کو المیہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اکثر ناقدین عینی صاحبہ کے اس اندازِ تحریر پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ جاگیردار طبقے کا زوال تو دکھاتی ہیں مگر ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ کیوں رکھتی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی پیش کی گئی

ہے کہ قرۃ العین حیدر چوں کہ خود بھی ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اودھ کے بڑے بڑے جاگیرداروں کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے تھے۔ اس لیے قرۃ العین حیدر اس طبقے کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں بیس بائیس سال کی عمر تک قرۃ العین حیدر نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اور جس سے وہ مانوس ہوئیں، وہ اودھ کے جاگیرداروں اور اعلیٰ طبقے کی پرآسائش، پرتکلف اور خوبصورت دنیا تھی۔''(۳)

یہ بات درست ہے کہ یلدرم صاحب کا اٹھنا بیٹھنا اس وقت کے صاحبِ حیثیت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اودھ کی تہذیب جاگیرداروں کی تہذیب تھی۔ چناں چہ ایک اعلیٰ طبقے کا فرد اس طبقے سے کنارہ کش نہیں رہ سکتا تھا مگر اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں لیا جا سکتا کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں جاگیرداروں کے خاتمے پر ہمدردانہ رویہ اس باعث تھا۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں زمیندار اور اعلیٰ طبقے کی عکاسی ابتداء سے تھی لیکن ٹوٹتے ہوئے جاگیرداری نظام نے ان کے افسانوں میں تجزیاتی گہرائی پیدا کر دی۔ وہ گذشتہ تہذیب کے رنگ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اب انحطاط پذیر ہونے والی تہذیب کا دکھ بیان کرتی ہیں۔ وہ ایک تہذیب کی موت اور دوسری کی پیدائش ونشو ونما کو اپنے مخصوص فکری انداز میں بیان کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے جن میں ہمیں جاگیرداری تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش دکھائی دیتے ہیں ان میں ''حسب نسب، جن بولو تارا تارا، سنگھاردان اور یاد کی ایک دھنک'' جیسے افسانے شامل ہیں۔

ترقی پسند مصنفین عینی صاحبہ کو ترقی پسندی کی سند دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک وہی ادب پارہ قابلِ قبول ہوسکتا تھا جو ان کے معیارات سے مطابقت رکھتا ہو اور قرۃ العین حیدر پر ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقے کے بارے میں کیوں نہیں لکھتیں۔ چوں کہ اس وقت کے تمام افسانہ نگار اسی کو حقیقت نگاری سمجھ کر انھی موضوعات پر لکھ رہے تھے اس لیے یہ قابلِ قبول نہ تھا کہ جاگیرداروں کی حمایت میں لکھنے والا اور بورژوا طبقے کی عکاسی کرنے والا ترقی پسند کہلائے۔

شہزاد منظر اس اعتراض کا بہت اچھا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ہمارے افسانہ نگاروں کی نہ تو اس طبقے تک رسائی تھی اور نہ اس طبقے کی زندگی سے شناسائی۔ وہ تو صرف اپنے طبقے کے بارے میں ہی جانتے تھے۔ اس لیے اپنے طبقے کے بارے میں لکھتے تھے۔ قرۃ العین حیدر اردو کی پہلی افسانہ نگار تھیں جو اس طبقے کی نمائندہ اور ترجمان بن کر سامنے آئیں۔''(۴)

قرۃ العین حیدر نے ہندوستان اور یورپ کی انٹلکچویل سوسائٹی میں زندگی گزاری۔ انھوں نے اعلیٰ سرمایہ دار طبقے کے جیتے دن اور جاگتی راتیں دیکھیں۔ وہ مختلف تہذیبوں اور تاریخوں کا نہ صرف مطالعہ رکھتی تھیں بل کہ ان

تہذیبوں میں زندہ تھیں۔ ان کے افسانوں میں اگر جاگیردارانہ تہذیب کے مٹتے رنگ دکھائی دیتے ہیں تو وہ سرمایہ دارانہ تہذیب اور اس نظام کی اصل حقیقت سے بھی مکمل آگاہی کا شعور رکھتی ہیں۔

وحید اختر کے خیال میں:

''وہ نئی مغرب زدہ تہذیب اور موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرت میں جہدِ معاش کی بے رحمی و خود غرضی سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کی کہانیوں میں یہی فضا ملتی ہے۔''(۵)

چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اپنے تہذیبی رنگوں سمیت منفرد انداز میں نظر آتا ہے۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' انیس برس کی عمر میں منظرِ عام پر آ گیا۔ اس مجموعے میں عنفوانِ عہد کی رفاقتیں، واہمے، خواب اور خوف و تحیر ان کی محبوب او رمرغوب منزلیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ''شیشے کے گھر'' کے بیشتر افسانے طبعی و مابعد الطبیعیاتی تصورات کی تصور کشی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں الفاظ، استعارے اور علامتیں وقت اور زندگی کے ابدی جبر میں قید مختلف سوالات کے جوابات تلاش کر رہے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں کے بعد چھپنے والے مجموعوں ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''روشنی کی رفتار'' میں شامل افسانوں میں ہمیں سامراجیت و استعماریت کی حقیقی صورت، ماضی کی بازیافت، اعلیٰ طبقے کی گذشتہ و موجودہ زندگی، سرمایہ دارانہ استحصال، جاگیردارانہ تہذیب کے مٹتے نقوش، انسانی شکست و ریخت، وقت اور تقدیر کا جبر، زندگی کی بے معنویت، معاشی انتشار اور عورتوں کی محرومی و پس پائی جیسے موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔

ایم خالد فیاض لکھتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر، میں سمجھتا ہوں وہ واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سامراجیت و استعماریت کو بین الاقوامی سطح پر سمجھا۔''(۶)

قرۃ العین حیدر کے جن افسانوں میں جاگیردارانہ نظام اور اس مٹتی ہوئی تہذیب کا رنگ پایا جاتا ہے ان میں ''جن لولو تارا تارا'' بہت ہی مشہور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ جاگیرداروں کی ذاتی زندگیوں میں افراطِ زر کی پیدا کردہ اخلاقی پستی، طبقاتی درجہ بندی اور منافقت کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ زمینداری کے خاتمے پر جاگیرداروں کی مفلسی اور ناداری کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ یہ افسانہ دلارے چچا کی کہانی ہے۔ دلارے چچا ''چھوٹی لائن'' والے کہلاتے تھے۔ چھوٹی لائن کی تشریح مصنفہ خود کرتی ہیں:

''فیوڈل کنبوں میں اگر کوئی منچلے رئیس زادے کسی مغنیہ، ڈومنی، گھریلو ملازمہ، قحط زدہ کسان لڑکی یا کسی ''نیچ ذات'' عورت سے نکاح کر لیتے یا اسے ''گھر ڈال'' لیتے تھے تو اس کی اولاد ''چھوٹی لائن'' کہلاتی تھی اور کبھی اپنے باپ کے خاندان سے ہم سری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ احساسِ کمتری اور افلاس میں مبتلا ان لڑکوں یا لڑکیوں کی شادیاں بھی خاندان میں نہ ہو سکتی تھی۔''(۷)

جاگیرداری نظام کی سفاکیت ملاحظہ فرمائیں کہ ایک جاگیردار اپنی عیاشی اور جنسی تسکین کا تو آسان حل تلاش کر لیتا ہے کہ کسی بھی کسان، مزارع یا غریب انسان کی بیٹی کو اپنی ہوس کا شکار بنا لے مگر اس سے نکاح کر کے اس کی اولاد کو عزت دینا اس کے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔ یعنی استحصال ہر صورت میں غریب ہی کا ہوگا۔

دلارے چچا بھی جاگیردار خاندان کی چھوٹی لائن تھے۔ ان کی والدہ نیچ ذات کی میراثن تھی مگر دلارے چچا کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی والدہ والد صاحب کی واحد منکوحہ تھی اور کوئی اور اولاد نہ تھی۔ چناں چہ دلارے چچا کل جائداد کے مالک تھے مگر خاندانی نجابت کے زیر اثر ان کی شادی خاندان میں نہ ہو سکتی تھی۔ دلارے چچا نہایت ہمدرد، شفیق، سادہ اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ایک دفعہ شہر میں ایک حسین فلمی اداکارہ دلارے چچا پر عاشق ہو گئی اور شادی کی خواہشمند ہوئی۔ دلارے چچا فلموں کے بے حد شوقین تھے۔ وہ اس اداکارہ سے نکاح کر لیتے ہیں مگر خاندان والے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ عورت شادی کے بعد باپردہ، پرہیزگار اور صوم وصلوۃ کی پابند ہو چکی تھی مگر پھر بھی دلارے چچا انھیں اپنی حویلی میں نہ رکھ سکے اور دور دراز ایک قصبے کے مکان میں رکھا جہاں دو سال کی مدت میں وہ نیک عورت دنیا سے رخصت ہو گئی۔

قرۃ العین حیدر نے یہاں جاگیرداروں کے کھوکھلے اصول اور معاشرے کی تنگ نظری پر طنز کیا ہے۔ سماج کے ٹھیکے داروں نے عزت کی مستحق عورت کو ذلت سے دوچار کیا مگر دوسری جانب جب انھی ظاہری عزت والوں کی بہو بیٹیاں کھلے عام ٹی۔وی اور فلموں میں کام کرتی ہیں تو زمانہ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے:

> ''علی گڑھ کالج کے بانی شیخ محمد عبداللہ کی صاحبزادی خورشید آپا، رینو کا دیوی بن کر اچانک تہلکہ مچا چکی تھیں۔ جب ان کی بھاوج ''پراسرنینا'' کے روپ میں پردۂ سیمیں پر آئیں تو لوگوں کو اتنا ذہنی دھکا نہ لگا اور اس کے کچھ عرصے بعد علی گڑھ کی زبیدہ حق عرف بیگم پارہ میں تبدیل ہوئیں۔ اس وقت تک دوسری جنگ عظیم ہندوستان میں خاصے سماجی انقلاب لا چکی تھے۔'' (۸)

یہ رینو کا دیوی ڈاکٹر رشید جہاں کی بہن اور محمود الظفر کی بیگم صاحبہ تھیں۔ ان کے علاوہ مصنفہ نے کئی معتبر ہستیوں مثلاً مختار بیگم، فریدہ خانم، امتیاز علی تاج، نجم الحسن، جمیلہ رزاق اور بیگم پارہ کا ذکر کیا ہے جو اپنے وقت کے مشہور ادیبوں اور سیاستدانوں کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ لوگ جب رکھتی تھیں۔ یہ لوگ جب فلموں میں کام کرتے تو معاشرہ انھیں بری نگاہ سے نہ دیکھتا اور یہ ہمیشہ ''بڑی لائن'' والے رہتے جب کہ چھوٹے لوگ ''چھوٹی لائن'' سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔

جاگیرداری نظام کی اس طبقاتی کشمکش کو بیان کرنے کے علاوہ مصنفہ نے دلارے چچا کے بڑھاپے کے دنوں کی مفلوک الحالی کا نقشہ بھی دل دوز انداز میں کھینچا ہے۔ زمین داری نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی دلارے چچا کے اچھے دن بھی ختم ہو گئے۔ گھر کا ساز وسامان بک گیا اور گھر ایک کھنڈر دکھائی دینے لگا۔ بڑے بڑے جاگیردار تو پھر بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے مگر دلارے چچا جیسے ''چھوٹی لائن'' کے مالک جاگیردار بھوکوں مرنے لگے:

''زمینداری کے خاتمے کے بعد دلارے چچا شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ساری زندگی بے فکری اور خوش حالی سے گزاری تھی۔ بیشتر مسلمان زمینداروں کی مانند کھانا کھلانے میں روپیہ اڑایا تھا۔۔۔۔اب اچانک ان کو افلاس اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑا'' (۹)

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں جاگیردارانہ تہذیب کی عکاسی کرنے کے علاوہ اعلیٰ طبقے والوں کی منافقت ، بے حسی اور سنگ دلی پر بھی تنقید کی ہے۔ طبقاتی کش مکش ایک انسان سے اس کا حق اور خوشیاں بھی چھین لیتی ہے۔ مٹتے ہوئے جاگیرداری نظام نے دلارے چچا جیسے نجانے کتنے جاگیرداروں کے چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''حسب نسب'' جاگیردارانہ نظام میں پرورش پانے والے اجو کی اخلاقی پستی کو بیان کرنے کے ساتھ چھمی بیگم کی ویران اور دکھی زندگی کا نقشہ بھی پیش کرتا ہے۔ چھمی بیگم جو اپنے حسب نسب ، روایات ، اقدار اور خاندانی اصولوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اپنے حسب نسب اور خاندانی شان کو قائم رکھنے کی خاطر یہ عورت کیسے کیسے دکھ جھیلتی ہے یہ افسانہ ان غموں کی عمدہ تصویر کشی کرتا ہے۔ اجو زمیندار خاندان کا واحد چشم و چراغ ہے اور چھمی بیگم کا منگیتر ہے۔ ماں باپ اور خاندان کے بڑے لوگوں کے مرنے کے بعد اجو چھمی کو انتظار کی سولی پر لٹکا کر خود لکھنؤ کی رنگینوں میں گم ہو جاتا ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد اجو گھر آتا ہے مگر اس کے ساتھ لکھنو کی ایک طوائف اور اس کی بیٹی ہوتی ہے۔ اجو جاگیردارانہ نظام کا نمائندہ عیش وعشرت کا شوقین اور بے راہ روی پر مائل ہونے کے باعث اس طوائف سے نکاح کر لیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے تیس سال انتظار اور ہجر کی صبحو بت کاٹنے والی چھمی بیگم کے دکھ کی عکاسی پر درد انداز میں کی ہے۔ عورت اسی استحصال کا شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ جاگیردار طبقہ بھی اسی استحصالی روش کو اپنائے ہوئے ہیں:

''چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل اندھا کنواں بن گیا۔ انھوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑ لی۔ لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔'' (۱۰)

چھمی بیگم کو اجو کی بے وفائی سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ ایک طوائف سے شادی کر کے اجو نے خاندانی حسب نسب تباہ کر دیا ہے۔ اسی غیرت کے سبب چھمی بیگم نے اجو سے گھر کے خرچے کے دوسو روپے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ خاندانی وقار کے ہاتھوں چھمی بیگم نے فاقے کاٹے گھر کا سامان بھی بک گیا مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی یہاں تک کہ پاکستان بن گیا۔ اجو فسادات میں مارا گیا اور کلو طوائف گھر کا سب مال و متاع سمیٹ کر غائب ہو گئی۔

قرۃ العین حیدر نے یہاں جاگیرداری نظام کے ختم ہونے اور بعد کے بدتر حالات کی بھی عکاسی کی ہے۔ زمینداری نظام کے خاتمے پر چھمی بیگم مزید حالات کے شکنجے میں کسی گئی۔ عدالت معاملات سے ناواقفیت کی بناء پر ان کا خالی گھر حکومتی قبضہ میں چلا گیا۔ چھمی بیگم کے زیورات ، قیمتی سامان یہاں تک کہ معمولی اشیاء بھی بک گئیں۔

گھر کے ملازم فاقوں سے مرنے لگے اور چھمی بیگم سلائی کرنے لگی۔ پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ خاندانی زمیندارنی دلی میں ایک سرکاری افسر کے گھر بچوں کو قرآن پاک پڑھانے پر ملازمہ ہو گئی۔ روزی کے چکر نے مختلف گھروں میں کام کروا کے آخر چھمی بیگم کو بمبئی رضیہ بانو کے گھر پہنچا دیا۔ مصنفہ نے یہاں جدید تمدن کی غیر متمدن تہذیب کی بھیانک صورت کو واضح کیا ہے۔ رضیہ بانو لڑکیوں کی سپلائر تھی اور کئی لڑکیاں اس کے دھندے میں شریک تھیں۔ چھمی بیگم چوں کہ پرانی روایات اور اقدار میں زندہ تھیں انھیں اس نئے دور کی برائیوں اور تہذیبی پستیوں کا اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ اسی بات پر خوش ہیں اور نوافل ادا کرتی ہیں کہ خدا نے ان کے خاندانی حسب نسب کی لاج رکھی اور عزت دار گھرانے سے ان کی روزی کا انتظام کر دیا۔

یہ افسانہ جہاں جاگیرداری نظام، مٹتی ہوئی جاگیرداری تہذیب اور عورت کے استحصال کی کہانی ہے وہاں جدید دور کی مادیت پرستی، اخلاقی زوال اور مسخ شدہ تہذیب کا بھی عکاس ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

> ''حسب نسب۔۔۔۔ قدیم معاشرت اور اس کے تباہ کن جاگیردارانہ نظامِ تہذیب کی یادگار، ایک نہایت شریف مگر سادہ لوح خاتون کی دل گداز داستان حیات ہے۔ اس کے ساتھ ہی جدید تمدن کی عیاش تہذیب کی نقاب کشائی بھی ہے۔ قدیم و جدید اقدار کے تصادم سے ایک ایسی مضحکہ خیز صورت پیدا کی گئی ہے جو بہت بھیانک ہے۔ بظاہر خاتمے پر ایک خندۂ استہزا یا تمسخر ابھرتا ہے مگر اس خندہ وتبسم کے پیچھے ایک دہشت خیز حقیقت ہے۔ زوال آدمیت کی۔'' (۱۱)

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں ہمیں کسی نہ کسی صورت میں تہذیبی المیہ ضرور جھانکتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ مٹتے ہوئے جاگیرداری نظام کی مٹتی ہوئی تہذیب مصنفہ کو ایک نئے دکھ سے دوچار کر دیتی ہے۔ ان لوگوں کی دل فگار اور دکھی زندگیوں کا عکس ان کے افسانوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ''ان کی تخلیقات میں جاگیرداروں اور ہندوستانی تعلیم یافتہ اشرافیہ کی خواب ناک زندگی ڈھلتی ہوئی شام تھی۔ ہندی تاریخ، تمدن اور تہذیب کے دھارے تھے، عام لوگوں کی دل زدہ اور دل فگار زندگیوں کا عکس تھا۔۔۔۔۔ سمتِ غیب سے ایسی ہوا چلی تھی جو ان کی ذات و کائنات کو راکھ کر گئی۔'' (۱۲)

قرۃ العین حیدر کا افسانہ'' سنگھار دان'' طوائفوں کی مجبور اور لاچار زندگی کی عکاسی کرنے کے علاوہ جاگیرداروں کی طوائف پرستی اور عیاشی کو بھی واضح کر رہا ہے۔ جاگیرداری نظام کے ٹوٹنے پر جاگیرداروں کی بدحواسی اور عیش و عشرت کے ختم ہو جانے کے احساس کی منظر کشی بھی کی گئی ہے مگر افسانے کا بنیادی موضوع طوائف کی حقیقی زندگی کے مسائل اور ان کے ساتھ معاشرے کا منفی سلوک واضح ہو کر افسانے میں سامنے آتا ہے۔

یہ کہانی حسن پری اور زمرد پری ہی کہانی نہیں ہے بل کہ یہ ہمارے معاشرے کے اس نفرت انگیز طبقے کی داستان ہے جو اپنی تمام عمر نفرتیں سمیٹنے میں گزار دیتا ہے اور اگر طوائفوں کے اس گروہ میں کوئی باغی زمرد پری پیدا ہو

جائے جو اس مکروہ زندگی کو چھوڑنا چاہے تو عزت کی زندگی حاصل کرنے کے لیے کربناک عذاب جھیلے تو آخر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تمام سفر لا حاصل ہے۔ اس کے دکھ جوں کے توں ہیں کیوں کہ ہمارا سرمایہ دار و جاگیردار معاشرہ ان کو عزت کا مقام کبھی بھی نہیں دے سکتا۔ یہ لوگ اس طبقے کو پیدا تو کرتے ہیں مگر عزت کے خواہش مند کو سرِ بازار برہنہ کر دیا جاتا ہے۔ مہاراجہ جگ مگ پور کا کردار ایسے ہی جاگیردار کا عکاس ہے جو زمرد پری کو اس کی پھوپھی کے ساتھ ساز باز کر کے پندرہ ہزار میں خرید لیتا ہے اور پڑھائی کے بہانے بیرون ملک لے جاتا ہے۔ زمرد پری کو چار ماہ اپنی داشتہ بنا کر رکھتا ہے مگر جاگیرداری نظام کے ٹوٹنے کی خبر سن کر زمرد پری کو لندن چھوڑ کر لکھنو چلا جاتا ہے۔

زمرد پری اپنے ماں، باپ اور اپنے وطن جانے کا خیال دل سے نکال دیتی ہے۔ وہ واپس اس ملک میں نہیں جانا چاہتی جہاں اس کا ماضی ہے۔ جہاں معاشرہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بل کہ وہ ایک انجانے ملک میں رہ کر باعزت زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ وہ ان گنت عذاب جھیلتی ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرتی، برتن دھوتی اور ساتھ ساتھ تعلیم مکمل کرتی ہے مگر کرب ناک انکشاف تو یہ ہے کہ اتنا سب کچھ کر لینے کے باوجود اس کے ماتھے پر لگا بدنامی کا داغ مٹ نہیں سکتا:

> ''ایک دن میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک محفل میں مدعو تھی۔ وہاں چند خواتین نے مجھے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر شروع کی اور جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ مجھے بڑا دھچکا لگا اس رات گھر واپس آکر میں نے سوچا، اس شرافت، اس پارسائی، اس محنت کشی سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟ یہ معاشرہ مجھے کبھی عزت نہ دے گا۔ میں یہاں سات سمندر پار بھی، اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں مہاراجہ جگ مگ پور کی سابق داشتہ زمرد بائی آف لکھنؤ ہی رہوں گی۔'' (۱۳)

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں ہمارے معاشرے کی بے حسی اور اس کا شکار ہونے والی طوائف کی زندگی کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ طوائف معاشی تنگ دستی اور مفلوک الحالی سے مجبور اپنے پیشے کا آغاز کرتی ہے اور پھر اس دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ یہ طوائف جوانی کے دن عیش کے ساتھ گزارتی مگر بڑھاپا نہایت اذیت ناک ہوتا۔ غربت اور مفلسی کے ساتھ ساتھ بیماری اور معاشرتی نفرت کے تلخ رویے طوائف کو بے موت مار دیتے۔ حسن پری کی اذیت ناک موت اور بدحالی وغربت کی تصویر کشی قرۃ العین حیدر نے بخوبی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے واضح انداز میں یہ حقیقت بیان کی کہ اس طبقے کو پیدا کرنے والے دراصل معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے افراد جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں۔ اربابِ نشاط کا اصل مفہوم زمرد پری کو سمجھ نہ آتا تھا۔ اسے بچپن میں نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے بڑے صاحبِ ثروت اور اعلیٰ اقتدار سے تعلق رکھنے والے لوگ ان کے گھر آتے مگر لوگ انھیں نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں:

> ''ذرا سیانی ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ ''اربابِ نشاط'' کے کیا معنی ہیں لیکن یہ طبقہ کس سماجی اور

معاشرتی نظام کا مرہونِ منت ہے، یہ سمجھانے والا مجھے کوئی نہ تھا۔'' (۱۴)

مگر درحقیقت یہ طبقہ ملکی معیشت کو چلانے والے صاحبِ اختیار طبقے کا مرہونِ منت ہے جو اس طبقے کی بقاء کا ضامن ہے۔

مجموعی طور پر قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں طوائف کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو سامنے لانے کے علاوہ جاگیردار و سرمایہ دار طبقے اور معاشرتی رویوں کی بھی عکاسی کی ہے۔

سراج منیر قرۃ العین حیدر کے طوائف کے تجزیہ پر لکھتے ہیں:

> '' قرۃ العین حیدر کے ہاں طوائف کی انفرادی زندگی اور اس کے Institutution کا ایک اتنا مکمل اور مربوط مطالعہ ہے کہ جس میں اس پورے ادارے کے نقش کمال کے ساتھ سمٹ گئے ہیں۔'' (۱۵)

قرۃ العین حیدر نے جاگیردارانہ تہذیب اور مٹتے ہوئے اس نظام کو بیان کرنے کے علاوہ سرمایہ دار طبقے کی اجارہ داری اور ہندوستان کی غربت، بے روزگاری اور غریب متوسط طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی بدحالی کی داستان بھی بیان کی ہے۔ ان کا افسانہ ''فقیروں کی پہاڑی'' جدید معیشت پر گہرا طنز ہے۔ مصنفہ نے ایک ایسی پہاڑی کا ذکر کیا ہے جہاں کسی حاجی بابا کا روضہ ہے۔ صبح سے شام تک ہزاروں عقیدت مند او رزائرین اس روضے کی زیارت کی خاطر کٹھن سفر کرتے، ان لوگوں میں بڑے بڑے سرمایہ دار، صنعتکار، فلم اسٹار اور ہزاروں قسم کے لوگ ہوتے جو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سراپا دعا ہوتے۔ وہ پہاڑی جھوٹے فقیروں کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ جو مختلف ڈھونگ رچا کر ان زائرین سے پیسہ بٹورتے۔ مصنفہ نے واضح کیا کہ جب بے روزگار طبقے کے پاس کرنے کو کچھ نہ رہے تب وہ پیٹ کی خاطر غیرت وخود داری کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور پھر ایسے ہی فقیر وجود میں آتے ہیں جو فقیروں کی پہاڑی پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس پیشے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ نسل در نسل اسی سے منسلک ہیں اور رہیں گے۔ تلاشِ معاش میں نکلا ہوا ایک پڑھا لکھا نوجوان جب بے روزگاری سے مایوس ہو جاتا ہے تو اسے ان فقیروں کا پیشہ متاثر کر جاتا ہے۔ وہ ایک فقیر گھرانے کا جائزہ لیتا ہے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے:

> ''ابا۔۔۔۔ابا۔۔۔۔یہ شبراتی کا بچہ کہتا ہے کہ وہ آج سے بھیک نہیں مانگے گا۔ اسکول میں پڑھے گا اور کام کرے گا۔۔۔۔۔ والد نے آکر شبراتی کے ایک تھپڑ رسد کیا، سالے موالی۔۔۔کبھی تیرے باپ دادا نے بھی کام کیا تھا جو تو کرے گا۔ ناک کٹائے گا؟ بدمعاش!''(۱۶)

ہندوستانی معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام نے اس مضبوطی سے جڑ پکڑ لی ہے کہ غریب طبقہ پیٹ بھرنے کی خاطر بھیک مانگنے پر مجبور ہے اور اب یہ ایسا پیشہ بن چکا ہے جو جدید اقتصادی نظام پر کاری ضرب ہے۔ فقیروں کا جائزہ لینے والا تعلیم یافتہ نوجوان بھی آخر یہی پیشہ اپنانے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اپنی ماں کو خط لکھتا ہے کہ اسے بہت اعلیٰ نوکری مل گئی ہے۔ سرمایہ دار شہر کے کنارے پر فقیروں کی اس پہاڑی پر اس نوجوان کو بھی ایک مناسب جگہ مل جاتی ہے جو اس جیسے سماج کے معاشی استحصال اور طبقاتی کش مکش کے کچلے افراد کے لیے گویا آخری پناہ گاہ ہے۔

''تار پر چلنے والی لڑکی'' افسانہ بھی سرمایہ دارانہ استحصال اور غیر منصفانہ معاشی نظام کو واضح کر رہا ہے۔ مصنفہ نے اس افسانے میں سرکس میں تماشا دکھانے والے افراد خصوصاً نوعمر لڑکیوں کی بے بس، مجبور اور پس ماندہ زندگی کی عکاسی کی ہے۔ یہ نازک نازک لڑکیاں سرکس کے خطرناک تماشوں میں حصہ لیتی ہیں۔ تار پر سائیکل چلاتی ہیں، فضا میں قلابازیاں لگاتیں ہیں اور موت کے منھ میں لوگوں کو کرتب دکھاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے تو دل چسپی کا سامان ہیں مگر ان کے اندر بہت بڑے گھاؤ ہیں، ان کی روحیں زخمی ہیں، ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ تلخ حقائق اس افسانے میں تب سامنے آتے ہیں جب ملک کے مشہور اخبار کا رپورٹر ان لوگوں سے انٹرویو لینے آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگدستی اور مفلسی انھیں اس پرخطر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ روز موت کے منھ میں جاتی ہیں اور اپنے ماں باپ کے لیے پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ لارا بھی ایسی ہی نوعمر معصوم لڑکی ہے جو غربت کے ہاتھوں اپنے ماں باپ کھو چکی ہے۔ اس کا بھائی ختم ہو گیا ہے اور اب اس کے دل میں اس معاشرے کے لیے نفرت اور حقارت ہے مگر وہ تار پر سائیکل چلانے پر مجبور ہے۔ اسے پیٹ بھرنے کی خاطر یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ اگر چہ وہ اس خطرناک زندگی سے ڈرتی ہے، خوفزدہ ہے مگر وہ اور اس جیسے باقی افراد یہ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں:

> ''مجھے آج تک ڈر لگتا ہے، روز شام کو ڈر لگتا ہے۔ ہر شام کو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آج پنڈال سے زندہ نہیں نکلوں گی۔ ہم سب کو ڈر لگتا ہے۔ سرکس کے سارے بہادر آرٹسٹوں کو روزانہ موت کا خوف رہتا ہے۔'' (۱۷)

مگر معاشرے کے صاحبِ اختیار لوگ، بڑے بڑے سرمایہ دار اور معاشی نظام پر قابض طبقہ ان لوگون کی مجبوریوں اور پریشانیوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ ملک میں کوئی ایسا اقتصادی منصفانہ نظام نہیں جو ان جیسے سب لوگوں کو سکون کی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے۔ آخر میں مصنفہ اس تلخی کو بیان کرتی ہے کہ انٹرویو لینے والا شخص اور اخبار کا مالک ان لوگوں کے مسائل منظرِ عام پر لانے کے بجائے کسی اور اسٹوری کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ کیوں کہ اس اخبار کا مالک ہی لارا کی قلاش زندگی کی وجہ تھا۔ اس کی بیوفائی نے لارا کو زندگی کے اس موڑ پر کھڑا کر دیا۔

''بڑے آدمی'' افسانہ بھی اونچے اور سرمایہ دار طبقے کی منافقت، بے حسی اور دوغلے پن کا عکاس ہے۔ سرمایہ دار طبقہ بظاہر تو اعلی اقدار اور متمدن زندگی کی پاسداری کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ دوہرے معیار کے حامل افراد ہوتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے طبقے کی محبت اور خلوص کو اپنا حق سمجھتے ہوئے ان کی زندگی کی حقیقی خوشیاں بھی چھین لیتے ہیں۔ ذکیہ غریب گھرانے کی باشعور، وفادار سلیقہ مند بچی ہے۔ اگر چہ وہ غریب ہے مگر حسین خواب دیکھتی ہے، بڑے بڑے گھروں میں خود کو چلتا پھرتا محسوس کرتی ہے۔ جوانی کے ان حسین خوابوں نے اس کے فطری جھکاؤ کو امیروں کی جانب کر دیا۔ وہ کبھی ڈپٹی صاحب کے گھر کے انتظامات اور امورِ خانہ داری سنبھالتی اور کبھی بہت بڑے سرمایہ دار سر اعجاز کے گھر کو سنوارتی، سر اعجاز کی بیوی اگر چہ اسے بظاہر پیار کرتی مگر دلی طور پر وہ اسے غریب طبقے کی ادنیٰ لڑکی ہی سمجھتی۔ ذکیہ سر اعجاز کی بیٹیوں کو بہنوں کی طرح پیار کرتی اور اعجاز اور ان کی بیگم کو ماں باپ کا درجہ دیتی مگر غریب کے خلوص اور پیار کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ سرمایہ دار اور اونچے طبقے والوں کو ہر صورت اپنا مادی مفاد عزیز

ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک مرتبہ سراعجاز کے گھر آنے والا خوبرو نوجوان ذکیہ کو ان کی بیٹی جان کر شادی کا پیغام بھیج دیتا ہے۔ لیڈی اعجاز سب کچھ جانتے ہوئے بھی ذکیہ کے ساتھ دھوکہ کرتی ہے اور اپنی بدصورت بیٹی گلناز کو اس شخص کے ساتھ بیاہ دیتی ہے کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک غریب کی لڑکی کے خواب پورے ہوں اور وہ ان کے برابر آ جائے۔ وہ تو اسے آج بھی ایک غریب گھرانے کی کم تر لڑکی سمجھتی تھی۔ اپنی بیٹی کی رخصتی کے بعد اس کے سب کپڑے ذکیہ کو تھما دیے کیوں کہ یہی اس کی وفا کی قیمت تھی۔

قرۃ العین حیدر نہ صرف ہندوستانی تہذیب کے اسرار و رموز سے آگاہ تھیں بل کہ وہ بیرونِ ملک مختلف ممالک میں جا کر رہیں اور ان کی تہذیبوں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ''کارمن'' افسانہ بھی تہذیب اور وہاں کے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کا عکاس ہے۔ مصنفہ نے کارمن نامی ایک فلپائنی لڑکی کی زندگی کی کہانی سنائی ہے جو نِک نامی لڑکے سے جنون کے حد تک پیار کرتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگرچہ نک امیر ہے، سرمایہ دار ہے مگر پھر بھی وہ میرے جیسی غریب لڑکی کو بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسے بہت چاہتا ہے۔ کارمن کی ذاتی زندگی بے تحاشہ دکھوں کا شکار ہے۔ اس کی ماں مر چکی ہے، باپ کو غربت کے باعث وہ بھی نہ بچا سکی۔ اس کی بیماری کے دنوں میں رہی سہی زمین گاؤں کے زمینداروں کو بیچ دی کچھ گروی رکھی۔ ان جاگیرداروں کے احکامات پورے کرتی مگر بے سود:

> ''میں دولت مند زمین داروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی مگر بابا کا علاج اور مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے آبائی گاؤں جا کر اناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمین داروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔''(۱۸)

کارمن کے ان الفاظ سے ہمارے ذہن میں فوراً اپنے ملک کا جاگیرداری نظام گھوم جاتا ہے۔ جو آج بھی اپنے استحصالی پنجے مضبوطی سے گاڑے ہوئے ہے۔ پوری دنیا میں یہ استحصالی معاشی نظام کسی نہ کسی صورت میں دکھائی دیتا رہتا ہے۔ اگرچہ کہنے کو یہ نظام اب یورپ اور دیگر ممالک میں ختم ہو چکا ہے مگر یہ اپنے حوالے آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

کارمن ان دکھوں کو نِک کی محبت میں بھلا دیتی مگر مصنفہ کی جب اچانک ملاقات نِک سے ہوئی تو بہت بڑے سرمایہ دار کا ڈاکٹر بیٹا ایک عدد خوبصورت بیوی کا خاوند اور ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔ وہ اس بات سے قطعی بے نیاز تھا کہ اس کے خوابوں کو سجائے، اس کی ذات پر خدا جتنا ایمان رکھے، اپنی شادی کے انتظار اور بچوں کے لیے کھلونے اکٹھے کرتی کارمن صرف اس کے لیے زندہ ہے۔ مصنفہ نے سرمایہ دارانہ نظام کی بے حسی اور سفاکیت کو بھرپور طریقے سے واضح کیا ہے جہاں غریب کے خوابوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''یاد کی اک دھنک جلے'' اگرچہ عورت کی قربانی، وفا اور ایثار کی کہانی ہے مگر افسانے

کا اختتام ہمیں عصرِ حاضر کی سرمایہ دارانہ معاشرت اور اس نظام کی پیدا کردہ بے حسی کو واضح کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر تہذیبوں، اقدار، زبان اور رشتوں کے زوال پر ہمیشہ دکھی ہوتی ہیں۔ اس افسانے میں بھی آج کی نسل میں پیدا ہونے والے اخلاقی بحران اور رشتوں کی بے حرمتی کے منفی پہلو کو واضح کیا ہے۔

گریسی چچی رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والی مذہبی، سادہ اور با خلوص عورت تھی۔ ناصر چچا کے ہاں اس وقت سے کام کر رہی تھی جب وہ بیس برس کی بیوہ تھی۔ ناصر چچا کی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا اور مرتے وقت مرحومہ نے گریسی کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے تین سالہ بیٹے علی اصغر کی ذمہ داری اسے سونپ دی تھی جیسے گریسی چچی نے بخوبی سرانجام دیا۔ وہ گھر کے تمام انتظام ماہر منتظم کی طرح سنبھالتی، ناصر چچا کا خیال رکھتی اور علی اصغر کا ہر لاڈ اٹھا فرض عین سمجھتی۔ ناصر چچا بڑھاپے میں معذور ہو گئے تو گریسی نے ان سے شادی کر لی مگر ان کی وفات کے بعد علی اصغر نے انھیں واپس اپنے ملک چلے جانے کا حکم صادر کر دیا:

> ''علی اصغر بزنس کے لیے ڈھاکہ چلا گیا اور مشرقی پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے گریسی چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا اور انھیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی اس لیے وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ شاید وہ اپنے دوستوں کو بتاتے ہوئے جھینپا تھا کہ گریسی چچی اس کی ماں ہیں۔'' (۱۹)

گریس چچی نہ جانے کہاں گم ہو گئیں۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک بے بضاعت، گم نام اور غیر اہم عورت نہ جانے بے قدری کا طوق اٹھائے کہاں کھو گئی۔ یہ وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے، وہ مادیت پرستی ہے جس کا شکار نئی نسل ہے جو محض ذاتی منفعت کا سوچتی ہے۔ علی اصغر اپنے کاروباری سلسلے کی خاطر اس عورت کو ٹھکرا دیتا ہے جس نے اسے تین سال سے پال پوس کر لاڈ اٹھا کر جوان کر دیا مگر اس کی کوئی بھی وقعت اور قدر نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر نے گریسی چچی کے کردار کی مدد سے آج کے دور کی ان تمام عورتوں کی تصویر کشی کی ہے جو اس ناقدری کا دکھ اٹھا رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا طویل افسانہ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' نئی معیشت، سیاست اور تہذیب پر ایک طنز ہے۔ اس افسانے کو ناولٹ بھی کہا گیا ہے۔ سو صفحات پر مشتمل یہ طویل افسانہ اپنے اندر ڈرامائیت، تجسس اور الم ناک حقائق سموئے ہوئے ہے۔ سیاسی آویزش، معاشی نظاموں کی جد وجہد، جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی طاغوتی طاقتوں کی جبریت اور اس کے خلاف انقلاب پسند نوجوان کی الم ناک موت یہ حقائق اس افسانے کا موضوع ہیں۔ مصنفہ نے افسانے کو دو ادوار میں منقسم کیا ہے۔ ایک آزادی سے قبل ہندوستان کے حالات پر مشتمل ہے جس میں انقلاب پسند سلمان مرزا اس کی محبوبہ ثریا حسین جیسے کرداروں کی مثالیت پسندی اور استحصالی معاشی نظام اور حکومتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد کی کہانی ہے۔ دوسرا حصہ تقسیم ہند کا تہلکہ اور آزادی کے بعد پاکستان کے حالات پر ہے۔ یہاں پہنچ کر تمام جدوجہد، مثالیت پسند اور انقلابی طاقت دم توڑ دیتی ہے اور اس کی جگہ خودغرضی، ریاکاری اور بدکرداری جنم لیتی ہے۔ نئی سرمایہ دارانہ فضا نے مادیت پرستی کی آگ کو ایسی ہوا دی جس میں سلمان مرزا کی محبوبہ

ثریا حسین اور سلمان کی بہن سلمیٰ مرزا تنکوں کی مانند بہہ گئیں۔ جمشید سید جو نودولتی ہے اور سرمایہ دار طبقے کا مضبوط ستون بن چکا ہے۔ وہ ثریا اور سلمیٰ کو بھی اپنی روش پر چلا لیتا ہے۔ سلمیٰ اپنے معاشی حالات کو درست کرنے کی خاطر بادلِ ناخواستہ ہی سہی مگر وہ جمشید کی ملازمت قبول کر لیتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی طرح بہتری اور بھلائی کا جھنڈا اٹھا کر اذیت کی راہ پر چلنا نہیں چاہتی، اس طرح ثریا حسین کا سرمایہ دارانہ نظام کے آگے ہتھیار پھینک دینا دراصل سلمان مرزا کے انقلابی رویے اور ان تھک جدوجہد کی شکست ہے۔ وہ شخص جو سماج کی نئی اور بہترین تشکیل کی خاطر سرمایہ دار اور حکومتی افسران سے بغاوت کرتا ہے اور آخر اپنے مقصد پر قربان ہو جاتا ہے اس شخص کی محبوبہ اور بہن کا اسی نظام کے ساتھ مفاہمت کر لینا دراصل بھلائی اور خیر کی شکست کا اعلان ہے۔ اس شخص کی شکست کا اعلان جس نے تمام زندگی قربانیاں دیں اور اپنے مقصد کو زندہ رکھنے کا وعدہ کیا۔ جب سلمان کا گھر جلا دیا گیا تب بھی اس کا صبر دیدنی تھا۔ اس کی آنکھ دور کے حالات دیکھ رہی تھی:

> ''تمھاری مسوری والی کوٹھی جلا دی گئی۔۔۔۔؟ ثریا نے پوچھا
> ہاں۔۔! اندھیرے میں سلمان کی آواز آئی۔ جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا اسی عصبیت کے ہاتھوں اس سماج کے محل جلا دیے گئے مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ماضی کی محل سرائیں جل کر راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہو رہا ہے۔'' (۲۰)

مگر آزادی کے بعد سلمان کو خفیہ پولیس والوں نے تشدد کر کے ہلاک کر دیا اور ثریا، سلمیٰ سرمایہ داری کے آگے جھک گئیں۔ یوں معاشرے کی فلاح، بہتر معاشی نظام کی جدوجہد اور استحصالی قوتوں کو ختم کرنے کی جنگ خاموشی سے ختم ہو گئی۔

مجموعی طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر ایک قابل اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز میں مختلف الجہات مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

پروفیسر قمر رئیس فاطمہ کہتی ہے:

> ''قرۃ العین حیدر اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے اس لیے منفرد ہیں کہ ان کے تمام افسانے موضوعات کے اعتبار سے نہ صرف منفرد بل کہ متنوع بھی ہیں۔ جب کہ ان سے پہلے موضوعات کی یہ رنگا رنگی بہت کم نظر آتی ہے۔'' (۲۱)

قرۃ العین حیدر نے جاگیرداری تہذیب کے ٹوٹنے کا المیہ مختلف انداز میں بیان کیا ہے مگر انھوں نے اس نظام میں جہاں جہاں برائیاں محسوس کیں اسے بھی بیان کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام، بورژوا طبقہ اور ان استحصالی قوتوں کی جبریت قرۃ العین حیدر کا بنیادی موضوع تھا۔ انھوں نے اس طبقے کی قوت اور اس کی انسان دشمنی کو واضح انداز میں

بیان کیا۔ اس نظام نے معاشرے میں جو طبقاتی کشمکش اور دیگر مسائل پیدا کیے ان کو قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں بے نقاب کیا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب کی بنا پر قرۃ العین حیدر ایک معتبر حوالہ کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

حواشی:

(۱) شہزاد منظر، قرۃ العین حیدر کے دس منتخب افسانے، تخلیقات، لاہور: ۲۰۰۷ء ص ۹۱۶

(۲) شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنائی، قرۃ العین حیدر (مرتبین) مدیر احمد زین الدین، نثری دائرہ، کراچی: جلد و شمارہ ۳۴، ۲۰۰۸ء، ص ۵۹

(۳) قمر رئیس، ڈاکٹر، قرۃ العین حیدر - ایک مطالعہ، مشمولہ قرۃ العین حیدر- خصوصی مطالعہ، (مرتبین) سید امیر حسن، شوکت نیم قادری، بیکن بکس ملتان: ۲۰۰۳ء، ص ۵۱۵

(۴) شہزاد منظر، قرۃ العین حیدر کے دس منتخب افسانے، ص ۱۲

(۵) وحید اختر، قرۃ العین حیدر کے افسانے، فکر و فن، مشمولہ اردو افسانہ، روایت و مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور: ۱۹۸۶ء، ۵۵۴

(۶) ایم۔ خالد فیاض، قرۃ العین حیدر کا افسانہ، آوارہ گرد، مشمولہ قرۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ، بیکن بکس ملتان: ۲۰۰۳ء، ص ۴۶۷

(۷) شہزاد منظر، قرۃ العین حیدر کے دس منتخب افسانے، تخلیقات لاہور: ۲۰۰۷ء، ص، ۲۰۵

(۸) ایضاً ، ص ۲۱۳

(۹) ایضاً ، ص ۲۱۴

(۱۰) ایضاً ، ص ۱۹۱

(۱۱) عبدالمغنی، قرۃ العین حیدر کا فن، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی: ۱۹۹۰ء ص ۱۷۳

(۱۲) زاہدہ حنا، قرۃ العین حیدر۔۔۔ ایسا کہاں سے لائیں، مشمولہ قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں (مرتبین) حسن ظہیر، شہاب قدوائی، ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ۲۰۰۹ء ص ۴۶۷

(۱۳) جمیل اختر (مرتب) آئینہ جہاں، کلیاتِ قرۃ العین حیدر، (جلد سوم)، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی: ۲۰۰۶ء ص ۳۲۳

(۱۴) ایضاً ، ص ۳۱۶

(۱۵) سہیل عمر، محمد (مرتب) مقالاتِ سراج منیر، اکادمی بازیافت کراچی: ۲۰۱۰ء، ص ۴۴۱

(۱۶) کلیاتِ قرۃ العین حیدر، ص ۲۸۹

(۱۷) ایضاً ، ص ۳۰۶

(۱۸) ایضاً ، ص۲۰۲

(۱۹) قرۃ العین حیدر، **پت جھڑ کی آواز**۔ مکتبہ اردو ادب لاہور: س۔ن، ص ۱۱۵

(۲۰) جمیل اختر (مرتب) **آئینہ جہاں**۔ جلد دوم۔ص ۳۲۸۔قمر رئیس فاطمہ، پروفیسر، قرۃ العین حیدر کے افسانے ، ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، انجمن ترقی اردو لاہور: ۲۰۱۰ء، ص۲۳

(۲۱) قمر رئیس فاطمہ، پروفیسر، **قرۃ العین حیدر کے افسانے–ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ**، انجمن ترقیِ اردو، کراچی: ۲۰۱۰ء، ص۲۳